محمد قاسم

تھے عجب دھیان کے در و دیوار

[جون ایلیا کی شاعری]

John Ailya is a well known name in the field of modern Urdu poetry. In his works, we find a unique style of poetic elements. He is conspicuous amongst his contemporaries due to his unique style of the use of metaphors and similes, and versification. In this article, an effort has been made to assess John's style from diverse angles so that the newness of his style is brought to light.

~~~~~~~~~

جون کی شاعری اس کی مختلف شخصیتوں کا ایک ''کولاژ'' ہے۔ وہ کبھی ''فقیہہ سبز قدم'' کو جانے کی تلقین کرتا ہے تو کبھی حاکم وقت کو مسند سے اتارنے کا پرچار کرتے ہوئے دکھائی دیتا ہے ہے۔ کبھی ''شہر دل'' کے محلوں میں محوخرام تو کبھی کسی یاد کے در پر بیٹھے ہوئے اپنا ''مثالیہ'' تلاش کرتا ہے۔ ''جہان خراب'' کو حاصل کن ٹھہرا کر، خدا کا رد لکھتے ہوئے خود کو خدا گزیدہ قرار دیتا ہے۔ یہ تمام چہرے مل کر جو شخصیت بناتے ہیں وہ ادب کی دنیا میں جون ایلیا کے نام سے جانی جاتی ہے۔

آج کی شاعری کا قابل لحاظ حصہ اجنبی اور نامانوس علامتوں اور استعاروں کا ایک ایسا گھنیرا اور پیچیدہ جنگل ہے جہاں ہر طرف سوائے انتشار اور بے ترتیبی کے کچھ بھائی نہیں
~~~~~~~~~

دیتا۔ ایسی بے ترتیب فضا میں شاعری ذریعہ ابلاغ کیسے بن سکتی ہے اور انسان کا انسان سے رابطہ کیسے ممکن رہ سکتا ہے۔ آج کل کی شاعری فرد کے نامانوس اور تجریدی خیالات کا پرچار تو ہے لیکن اس کی علامتیں اور استعارے صرف مغائرت کو جنم دیتے ہیں اور انسانی رشتوں اور رابطوں کی ڈور ڈھیلی پڑتی نظر آتی ہے۔ اس ابتذال شیوہ ماحول میں شاعری بنجر پن سے کیسے محفوظ رہ سکتی ہے۔

جون نے زندگی پر اپنی ہی آنکھ سے نظر کی ہے اور اپنے احساس و شعور کو روشن رکھتے ہوئے اپنی ذات کے امکانات کو تلاش کرنے کی کوشش کی ہے، انہی امکانات نے اسے محوکلام لوگوں کی پھیلتی، بڑھتی آوازوں میں گم ہونے سے بچالیا ہے۔

حیران ہونا اور حیرت میں مبتلا کر دینا دو مختلف عوامل ہیں۔ ضروری نہیں کہ حیران ہونے والا کسی دوسرے شخص کو بھی حیرت میں مبتلا کر سکے۔ لیکن جون ایسا کر سکتا ہے اس کے ہاں جہاں حیران ہونے کی زبردست صلاحیت موجود ہے وہیں چونکا دینے کی بے پناہ قوت بھی موجود ہے۔ اس کی مثال اس بچے کی سی ہے جو ہر نئی چیز کو دیکھ کر محو حیرت ہو جاتا ہے اس کی آنکھوں کی چمک اسی حیرت سے منور ہے اگر دیکھا جائے تو حیرت ہی ہے جو سچے تخلیق کار پر نئے در وا کرتی ہے اور اسے بانجھ ہونے سے بچا لیتی ہے۔

پر حال ہوں پہ صورتِ احوال کچھ نہیں
حیرت ہے میرے پاس نظر کس کے پاس ہے؟

شدید ادعائیت نفی پسندی اور لاادریت وہ عناصر ہیں جو کہ جون کی شخصیت کی بنیاد ہیں اور کم و بیش یہی شخصیت اس کی شاعری میں جلوہ نما ہے۔ جون کی شاعری ذات کی تلاش کا وہ سفر نامہ ہے جس کے ہر منظر میں یہ تینوں رنگ اس طرح ترتیب پاتے ہیں کہ ایک بنیادی رنگ وجود میں آتا ہے جسے ہم اس کی اَنا بلکہ شدید اَنانیت سے موسوم کر سکتے ہیں جس کے سامنے کوئی شے ٹھہر نہیں سکتی...... اور یہ انا مستی لوگوں کی دل آزاری اور ناراضگی کا باعث بنتی

ہے۔اسے اپنی ذات کے آگے کچھ دکھائی نہیں دیتا۔

ہاں ٹھیک ہے میں اپنی انا کا مریض ہوں
آخر مرے مزاج میں کیوں دخل دے کوئی

☆

ہے تقاضا مری طبیعت کا
ہر کسی کو چراغ پا کیجیے

اپنی اس اَنانیتی کے باعث اس کے ہاں نفی پسندی کا چلن بہت نمایاں ہے۔نفی پسندی اور ارتیابیت دراصل اس یقین کے رخصت ہوجانے کا نتیجہ ہے جو کبھی اس کی ذات کا حصہ ہوا کرتا تھا...... یقین سے محروم ہوکروہ گماں کی محفلیں سجاتا ہے لیکن یہ بھی اس کے درد کا درماں نہیں کرتیں اوراس کے لیے باعثِ اذیت ثابت ہوتی ہیں۔

بڑا بے آسرا پن ہے سو چپ رہ
نہیں ہے یہ کوئی مژدہ خدا نئیں

جب یہاں بھی اسے پناہ میسر نہیں آتی تو وہ سودوزیاں سے ماورا ہوکر خدا کی ذات کا منکر ہوجاتا ہے:

ہم نے خدا کا رد لکھا نفی بہ نفی لا بہ لا
ہم ہی خدا گزیدگاں تم پہ گراں گزر گئے

☆

یوں جو تکتا ہے آسمان کو تو
کوئی رہتا ہے آسمان میں کیا

☆

انکار ہے تو قیمت انکار کچھ بھی ہو
یزداں سے پوچھنا یہ ادا اہرمن میں تھی

☆

حق کے منکر ہیں انا الحق کے بھی منکر سو ہمیں
وہ سزا دیجیو جو دارورسن کے پاس نہیں

☆

اے خدا (جو کہیں نہیں موجود)
کیا لکھا ہے ہماری قسمت میں

تشکک اور لاادریت کے اس پس منظر میں حکمائے فلسفہ کے وہ نظریات ہیں جن کی بنا ہی شک ،یقین سے محرومی اور ارتیابیت پہ استوار ہے۔ان نظریات نے جونؔ کے ذہنی سفر کی تشکیل میں ایسے انمٹ نقوش ثبت کیے ہیں کہ اب چاہتے ہوئے بھی اس کی مراجعت بعید از امکان ہے اور وہ یقین سے بچھڑ کر گمان کے سرابوں میں صدف کا متلاشی ہے...... یہاں کبھی وہ خود سے گریز پا ہے تو کبھی خدا سے:

کبھی خود سے مکر جانے میں کیا ہے
میں دستاویز پہ لکھا ہوا نہیں

اپنی ذات سے انکار اور فرار کے بعد وہ خدا کی ہستی کا بھی منکر ہو جاتا ہے۔ یہاں وہ (Aliention) کا قائل اور پیرو دکھائی دیتا ہے کہ جو تہذیب جدید کی دین ہے اور یقین سے محرومی کا ایک بڑا سبب بھی ہے۔

اے خدا!
اے خداوند!
اب مرا باطن ذات ویران ہے
اب درون دروں
فقط اک خلا ہے
فقط ایک لا
....

اے یقیں کے گماں

اے گماں کے یقیں

اے اَزل آفریں

اے ابد آفریں

اے خدا الوداع

اے خدایاں خدا

الوداع، الوداع (رمزِ ہمیشہ)

جونؔ جب "دل گلی" کی بات کرتا ہے تو اس سے مراد صرف دل یا گلی ہی نہیں بلکہ دِل اس کے ہاں امروہے کی تہذیب کی علامت بن کر سامنے آیا ہے۔ جس کی گلیاں، محلے اس کی ذات کا حصہ ہیں۔ اس کی "حالتِ حال" اور "حالتِ حال افزا" میں گماں کی گلیاں، گمان کے گوشے اور دھیان کی سادھیاں ہیں جو ایک پل بھی اس سے جدا نہیں ہوتے۔ ان کی یادیں اسے اپنے سحر میں جکڑے رکھتی ہے...... امروہے کی تہذیب کا وہ "فرد" اب اس تہذیب کا حصہ نہیں رہا لیکن وہ تہذیب اس کی ذات کا حصہ بن گئی ہے وہ دل کو کبھی گلی محلوں اور کبھی یادوں کی صورت میں دیکھتا ہے اور یہ یادیں کبھی اسے اماں بخشتی ہیں اور کبھی بے اماں کیے دیتی ہیں۔

ہم تو جیسے وہاں کے تھے ہی نہیں
بے اماں تھے اماں کے تھے ہی نہیں
اس گلی نے یہ سن کے صبر کیا
جانے والے یہاں کے تھے ہی نہیں

اسے دکھ ہے تو یہ ہے کہ جو لوگ اس کے ہم سفر تھے وہ گرد بادِ حیات کی نذر ہو چکے ہیں اور اب ان کی یادیں ہیں جن کی ٹمٹاتی لو میں "دل محلے" کی گلیوں میں وہ اپنی صورت اپنی شناخت تلاش کرتا پھرتا ہے...... کھوجنے کا یہ عمل شاید لاحاصل کی جستجو ہے۔ کیونکہ جب وہ سراغِ شہرِ دل کو نکلتا ہے تو اسے گرد سے واسطہ پڑتا ہے اور ہر طرف دھول ہی دھول اڑتی دکھائی دیتی

ہے......لیکن ایک کشاکش بہرحال اس کی ہم رکاب ہے اور اس کا مقدر ہے۔

پھر اس گلی سے اپنا گزر چاہتا ہے دل
اب اس گلی کو کون سی بستی سے لاؤں میں

وہ اپنی لاش اٹھائے یادوں کے قبرستان میں جانکلتا ہے جہاں وہ تنہا ہے مگر زندہ رہنے پر مجبور کر دیا گیا ہے۔

اب وہ گھر اک ویرانہ تھا بس ویرانہ زندہ تھا
سب آنکھیں دم توڑ چکی تھیں اور میں تنہا زندہ تھا
ساری گلی سنسان پڑی تھی بادِ فنا کے پہرے میں
ہجر کے دالان اور آنگن میں بس اک سایہ زندہ تھا
وہ دوپہر اپنی رخصت کی ایسا ویسا دھوکہ تھی
اپنے اندر اپنی لاش اٹھائے میں جھوٹا زندہ تھا

اس تمام کہانی کو سننے کے بعد یہ بات واضح ہوتی ہے کہ اس کے ہاں ،دل ،گلی، محلے ، شہرِدل، محفل ،بستی اور راہوں کی کیا اور کس سطح کی معنویت ہے اور ان سے اس کا کیسا عجب درد کا ناتا ہے۔

جونؔ کی شاعری ہنسنے کھیلنے یا دل بہلانے کی چیز نہیں ہے بلکہ یہ تو احساسِ ذات کی کرچیاں اور ادراک کے وہ گھاؤ ہیں جو صرف محسوس کیے جاسکتے ہیں بجھائے یا سمجھائے نہیں جاسکتے کیونکہ شاعری احساس سے ہم کلام ہونے کا نام ہے نا کہ وضاحت وتوضیح کی کھتونیوں کا:

آگہی نے کیا ہو چاک جسے
وہ گریباں بھلا سلے بھی کہاں

یہ گھاؤ اور کرچیاں جب ذات میں پیوست ہوجائیں تو انسان خون تھوکنے اور زخم کریدنے پر مجبور ہوجاتا ہے۔ خون تھوکنے کی داستان جس شدت اور جنون کے ساتھ جونؔ کی شاعری کا حصہ بنی ہے اس کے معاصرین کے ہاں اس کا تذکرہ کم کم ہی ہے۔ بات یہ ہے کہ کہانی اس

کی ذات کی کہانی ہے۔ کہانی کہنے والا بھی وہ خود ہے اور سننے والا بھی خود...... اس کہانی کی دو سطحیں ہیں...... پہلی سطح پہ ہم اس فنکار سے متعارف ہوتے ہیں جو اپنے ماحول سے ناآسودہ ہے۔ جسے یہ احساس شدت سے بے چین کیے رکھتا ہے کہ فن تو رخصت ہوتا جا رہا ہے مگر صاحبانِ ہنر خیرت سے ہیں اور وہ لوگ جو کبھی دوسروں کے تکلم کو جاں بخش کیا کرتے تھے وہ یہاں اپنے ہی ہونٹوں پر مرمٹے ہیں...... ایسی صورت میں اس کا فنکار ہونا اس کے لیے باعثِ عذاب ہے اور اس کے خون تھوکنے کا موجب بنتا ہے اور بالآخر اس کا ہنر ٹھہرتا ہے۔

خون کی تھوکن ہے جو تمہاری، کیا ہے وہ اک پیشہ کہ نہیں
تم ہو مسیحاؤں کے حق میں قاتل اندیشہ کہ نہیں
فن جو بجز فن کچھ بھی نہ ہو وہ اک مہلک خوش باشی ہے
کار سخن پیشہ ہے تمہارا جو خونی عیاشی ہے
(جون تمہیں یہ دور مبارک ہو)

☆

تھوکا ہے میں نے خون ہمیشہ مذاق میں
میرا مذاق آپ ہمیشہ اڑائیے

☆

رنگ ہر رنگ میں ہے داد طلب
خون تھوکوں تو واہ واہ کیجیے

اب ہم اس کہانی کی دوسری سطح کے متعلق بات کرتے ہیں۔ کہانی کی یہ سطح فن کی اس بساط رنگ سے متعلق ہے کہ جہاں بجائے زمزمہ خوانی کے تباغض کی کیفیت پیدا ہوجاتی ہے اور بالآخر دو فنکاروں کے درمیان کشاکش پر منتج ہوتی ہے۔ کہانی کی یہ دوسری سطح اس لہو سے مملو ہے جو ایک تخلیق کار (زاہدہ حنا) کی دین ہے کہ جس کے عروج میں اسے اپنا زوال دکھائی دیتا ہے۔

اس کے عروج کی تھی بہت آرزو ہمیں
جس کے عروج میں ہمارا زوال تھا

اس کہانی کا یہ حصہ بہت نازک ہے جب اس کی ذات پہ چوٹ پڑتی ہے اور اس کی انا سے اس کی ہم کار کی انا ٹکراتی ہے تو وہ تلملا اٹھتا ہے۔اس کے حواس رخصت ہو جاتے ہیں اور وہ رنجش میں یہ بھی نہیں سوچتا کہ کچھ سخن تو زباں کے تھے ہی نہیں...... یہیں سے وہ دوری اور مغائرت جنم لیتی ہے جو بعد میں جونؔ کی ذات میں ڈیرے ڈال کر اسے آسیب زدہ کر دیتی ہے اور یہی رنگ بچھانا اور خون تھوکنا اس کا معیار اور کاروبار بن جاتا ہے۔اس تمام پس منظر کے باعث وہ شوقِ کمال اور خوفِ زوال سے بے نیاز ہو کر خود کو تباہ کر لیتا ہے اور مسلسل جدائی اور جان کنی میں لہو تھوکنے پہ مجبور ہو جاتا ہے۔

اس مسلسل شبِ جدائی میں
خون تھوکا گیا ہے مہ پارہ

☆

خون ہی تھوک رہا ہوں بچھڑ کے اس سے
وہی تو رنگ رساں ہے تمنا ہو یا ہو

☆

کیا گلہ خون جو اب تھوک رہے ہیں جاناں
ہم ترے رنگ کے پرتو سے سجائے بھی گئے

☆

بیٹے کے لیے نظم ''درختِ زرد'' میں جونؔ لکھتا ہے:

تمہاری ارجمند امی کو میں بھولا بہت دن میں
میں ان کے رنگ کی تسکین سے نمٹا بہت دن میں
وہی تو ہیں جنہوں نے مجھ کو پیہم رنگ تھکوایا
وہ کس رنگ کا لہو ہے جو میاں میں نے نہیں تھوکا
لہو اور تھوکنا اس کا ہے کاروبار بھی میرا
یہی ہے ساکھ بھی میری یہی معیار بھی میرا

(درختِ زرد)

ان دونوں سطحوں پہ نا آسودہ و نارسا ہو کر وہ اپنے باہر سے تمام رشتے و رابطے توڑ دیتا ہے اور اپنی ذات کی دہلیز پر دھونی رما کر بیٹھ جاتا ہے۔ اپنے ماحول سے فرار حاصل کر کے اسے پناہ ملتی ہے تو صرف اپنے پیکر میں...... خود میں ٹھہرنے کی صورت اس وقت پیدا ہوتی ہے جب انسان اپنے اوپر خارج کے تمام روزن و در بند کر دیتا ہے۔

لے کے سمتوں کی ایک بے سمتی
گم ہوا ہوں اپنے پیکر میں

☆

جو پھرے دربدر یہاں وہ لوگ
اپنے باہر بہت ہی کم نکلے

☆

عجب ایک ہم نے ہنر کیا وہ ہنر بطور دگر کیا
کہ سفر تھا دور دراز کا سو ہم آ کر خود میں ٹھہر رہے

جونؔ کے کلام میں میں Paradox یا محالیہ کہہ لیجیے کو خاص دخل ہے۔ جہانِ معنی کی جہات ہیں کہ بے تکلفی اور رچاؤ سے اس کے اشعار کا حصہ بن جاتی ہیں اور یوں محسوس ہوتا ہے کہ یہ Paradox اس کے شاعرانہ مزاج کا حصہ ہیں۔

پرسشِ حال ہے نہ رسمِ تپاک
ہو گیا ہوں بہت مقرب کیا

☆

کیا میں اس کو تیری تلاش کہوں
دل میں اک شوق ہے جدائی کا

☆

ملتے رہیے اسی تپاک کے ساتھ
بے وفائی کی انتہا کیجیے

''شاید'' سے ''یعنی'' تک کے شعری سفر کا اگر جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ جونؔ کے ہاں دو رجحانات کو نمایاں فروغ ملا ہے۔''شاید'' سے ''یعنی'' تک پہنچتے پہنچتے جونؔ کے ہاں جنس کا رجحان بہت غالب اور نمایاں ہو گیا ہے۔ اگر چہ پہلے مجموعہ میں بھی اس حوالے سے اشعار مل جاتے ہیں لیکن دوسرے مجموعہ کلام میں ان میں سے بیشتر اشعار کی سطح بہت پست درجے کی ہے اور ان کو پڑھتے ہوئے یہ محسوس ہوتا ہے کہ یہ بجائے ایک لطیف جذبے کے سوقیانہ پن اور ابتذال کی تشہیر و تبلیغ کے داعی ہیں۔ اگر دیکھا جائے تو اس کا محرک ذہنی و جسمانی سطح کی وہ مغائرت ہے جو ایک آسیب کی طرح اس کے ذہن پر طاری ہو گئی ہے۔ ذہنی و جسمانی سطح کی یہ خلیج جب کسی طرح بھی کم نہیں ہو پاتی تو اس کی زبان اور خیالات ایسی صورت اختیار کر لیتے ہیں جسے ہم ابتذال کا نام دے سکتے ہیں۔

نفسیاتی سطح پر دیکھا جائے تو ڈھلتی عمر میں یہ ''احساسِ نارسائی'' شدید سے شدید تر ہو جاتا ہے اور جب انسان ''مجبور'' ہو جاتا ہے تو باتوں میں پناہ ڈھونڈتا ہے اور اپنے جی کا غم ہلکا کرنے کے لیے اس طرح کے خیالات کا سہارا لیتا ہے۔ جونؔ کی ازدواجی زندگی میں ایک خلا اور مسلسل بعد کی جو کیفیت پیدا ہو گئی تھی اور جو چاہتے ہوئے بھی کسی طور کم نہ ہو سکی تو ایسی صورت حال میں اس کے ہاں ان جذبوں کا بار بار اور شدت سے عود کر آنا کوئی ایسا عجیب بھی نہیں ہے۔ بہر حال وہ ایسے اشعار کو اپنے مجموعہ کلام کی زینت نہ بناتا تو یہ اس کے لیے کہیں بہتر ہوتا۔

اپنی ورزش کے دھیان ہی سے ہمیں
مار رکھتے ہیں صندلیں راناں (شاید)

''شاید'' میں جنسی جذبے کا یہ رجحان خال خال ہے جب کہ ''یعنی'' میں یہ شدت اختیار کر جاتا ہے۔ یہاں اشعار کی سطح ایسی رکیک ہے کہ لکھنو کے ریختی گو بھی شرماتے اور پناہ مانگتے دکھائی دیتے ہیں ہیں۔ یہ اشعار اس کے دامن پہ بدنما داغ ہیں۔

تشنہ لب ہے کب سے دل سا شیر خوار
تیرے دودھوں سے ہیں چشمے جاریاں

''شاید'' سے ''یعنی'' تک کے شعری سفر میں دوسرا نمایاں رجحان وہ Absurdity ہے کہ جہاں لفظ و معانی کے رشتے ٹوٹتے ہوئے نظر آتے ہیں، یوں گماں ہوتا ہے کہ سوائے ''یاوہ گوئی'' کے کچھ بھی نہیں...... یہ ایسا مقام ہے جہاں پہنچنے پر یہ احساس شدت اختیار کر جاتا ہے کہ بہت کچھ جان لینے پر بھی دامن خالی کا خالی ہی ہے اور کم مائیگی کا یہ پچھاڑ دینے والا احساس فزوں سے فروں تر ہوتا چلا جاتا ہے۔

خونِ جگر کھپا کے مصور نے یک نظر
دیکھا تو اک مرقع بے خدوخال تھا

رائیگانی کا یہ احساس لہو کے سناٹے میں ایسا گونجنے لگتا ہے کہ یقین و گماں کی تمام تر شمعیں گل ہوتی نظر آتی ہیں۔ ایسا کیوں ہوتا ہے؟ اس بارے میں یہی کیا جاسکتا ہے کہ فرد کی ذات جب پے در پے احساس شکست سے دوچار رہی ہے تو اس طرح کے محسوسات دل و دماغ کا حصہ بن جاتے ہیں اور یوں یہ احساسِ شکست ورائیگانی بالآخر Absurdity پہ جا کر منتج ہوتا ہے۔ ایسی کیفیت شاید اس وقت پیدا ہوتی ہے جب بے تاب اجالوں کی تڑپ کو مٹی کا دیا میسر نہیں آتا یا بقدرِ ظرف و شوق ایسا ہو نہیں پاتا۔

معاصر ادبی فضا میں جس طرح یہ احساس جونؔ کی شاعری کا حصہ بنا ہے وہ آپ اپنا تعارف ہے۔ ''شاید'' اور ''یعنی'' کے نام بھی خاص تاثر اور بھرپور معنویت کی طرف اشارہ کرتے ہیں...... ان ناموں پہ غور کرنے پر یہ بات سمجھ میں آنے لگتی ہے کہ ان کی کیا معنویت ہو سکتی ہے۔ یہ معنویت فلسفیانہ بھی ہے اور شاعرانہ بھی۔ یہ معنویت یقین و گماں کے رشتوں اور لفظ و معانی کے رابطوں میں ڈھیلی پڑتی طنابوں میں نمایاں طور پر محسوس کی جا سکتی ہے یہ مغائرت کا ایک ایسا رشتہ ہے جو گماں و امکاں کے درمیان ظاہر ہوتا ہے اور بڑھتا ہی چلا جاتا ہے۔

میں نے معنی میں، نہ پائے کوئی معنی یعنی
لفظ ہی مآلِ زباں ہے تنا ہو یا ہو

کوئی معنی نہیں کسی شے میں
اور اگر ہوں بھی تو میاں تب کیا

☆

لفظ و معنی کا بہم کیوں ہے سخن
کس زمانے میں تھیں ان میں یاریاں

لفظ و معانی کی اس مغائرت کی بھرپور عکاسی وہاں ہوتی ہے جہاں شاعر یہ سوال اٹھاتا ہے کہ وہ اقلیم سخن کہاں ہے کہ جہاں حرف و معنی باہم متصل و پیوست ہوں..........شاید کہیں نہیں۔

کہاں ہے سمتِ گماں وہ جہانِ جان پرور
کہ جس کی شش جہتی کا فسونِ چشم کشا
دلوں میں پھیلتا ہے منزلوں میں پھیلتا ہے
جہاں سخن ہے ساعت نظر ہی منظر ہے
جہاں حروف لبوں سے کلام کرتے ہیں
جہاں وجود کے معنیٰ خرام کرتے ہیں

(تا کجا)

اپنے مزاج کی اختراع پسندی کے سبب نئی زمینوں، قافیہ تراشی اور ردیفوں کی اس کے ہاں خاص معنویت ہے۔

"تم کہاں جاو گے ہم کہاں جائیں گے"......"شام بخیر شب خیر"......"گئی پل کا تو گئی پل کا میں"......"نیں"......"تنا ھو یا ہو"......"جبر ہے"......"اٹھ چل"......"خیریت سے ہیں"......"اب تم یاد نہیں آتے"۔

جون کے ہاں علامتوں کے استعمال کا ایک اپنا انداز ہے اور ان کے تصرف میں اس نے رنگوں سے خاص کام لیا ہے اور ایک عجیب طرح کی معنویت کو اجاگر کیا ہے۔

"موج شمال سبز"......"فقیہہ سبز قدم"......"زرد ملال"......"گمانِ زرد"......"نکہتِ یادِ سبز فام

''خوابِ زمردین خیال''......''......

نئی نئی اور اچھوتی تراکیب تراشنا بھی جونؔ کا خاصہ ہے مثلاً

خراباتیانِ خرد باختہ......نغمہ طرازانِ برافروختہ...... ہلاک ورزش فرضِ محال......

امتِ شیونِ رائگاں......دل زدگانِ خودنگر......جیب نگاہ......منجنیقِ منبر

ان تمام پہلوؤں کو اگر یکجا کیا جائے تو یہ کہا جاسکتا ہے کہ جونؔ نے غزل کی روایتی فضا میں رہتے ہوئے خود پر اجتہاد کا در بند نہیں ہونے دیا بلکہ اپنی اختراع پسندی میں حیرت کو سموتے ہوئے فکری و لسانی سطح پر ایسے تجربات کو اس طرح غزل آمیز کیا جائے جو اس کی شناخت بن گیا ہے۔اس کی پہچان بن جانے والے اشعار جو آپ اپنا تعارف ہے اور اسے یاد رکھے جانے کے لیے کافی ہیں، پیش خدمت ہیں:

تھے عجب دھیان کے در و دیوار
گرتے گرتے بھی اپنے دھیان میں تھے

☆

یہ بستی ہے مسلمانوں کی بستی
یہاں کارِ مسیحا کیوں کریں ہم

☆

حاصلِ کُن ہے یہ جہانِ خراب
یہی ممکن تھا اتنی عجلت میں

☆

مستقل بولتا ہی رہتا ہوں
کتنا خاموش ہوں میں اندر سے
میرے اندر کجی بلا کی ہے
کیا مجھے کھینچتا ہے مسطر سے

☆

بولتے کیوں نہیں مرے حق میں
آبلے پڑ گئے زبان میں کیا
☆
ہم نے جانا تو ہم نے یہ جانا
جو نہیں ہے وہ خوب صورت ہے
☆
کون اس گھر کی دیکھ بھال کرے
روز اک چیز ٹوٹ جاتی ہے
☆
کل دوپہر عجیب سی اک بے دلی رہی
بس تیلیاں جلا کے بجھاتا رہا ہوں میں
☆
جانے کیا واقعہ ہوا کیوں لوگ
اپنے اندر نہیں رہے آباد
☆
نظر پر بار ہو جاتے ہیں منظر
جہاں رہیو وہاں اکثر نہ رہیو
☆
یہاں میں ذکر نہیں کر رہا مکینوں کا
کبھی کبھی در و دیوار مرنے لگتے ہیں
☆
مانگ لے یاد کوئی پتھر سے
وقت پتھرا گیا ہے پتھر میں
☆

اس کی گلی سے اٹھ کے میں آن پڑا تھا اپنے گھر
ایک گلی کی بات تھی اور گلی گلی گئی

اس کی امید ناز کا ہم سے یہ مان تھا کہ آپ
عمر گزار دیجیے عمر گزار دی گئی

☆

فکر ایجاد میں گم ہوں مجھے غافل نہ سمجھ
اپنے انداز پر ایجاد کروں گا تجھ کو

☆

ہو گا جس دن فنا سے اپنا وصال
ہم نہایت سجائے جائیں گے

جونؔ نے قیام لاہور کے دوران کسی اخبار کو انٹرویو دیتے ہوئے کہا تھا کہ وہ بیسویں صدی کے سب سے بڑے شاعر ہیں...... اس بات کو ان کی معصومیت سے تعبیر کرنے کے سوا اور کیا کہا جا سکتا ہے۔ اردو شاعری میں اپنے طرز کے منفرد لب و لہجے کے شاعر کے طور پر انھیں دیکھا جا سکتا ہے لیکن بیسویں صدی کے سب سے بڑے شاعر کی حیثیت سے دیکھنا، بیسویں صدی کے اردو شعراء کے ساتھ نہیں تو خود ان کے ساتھ بہر حال زیادتی ہوگی۔ اس تمام بحث کو انہی کے شعر پہ ختم کرتے ہیں۔

اپنا کمال تھا عجب اپنا زوال تھا عجب
اپنے کمال پر درود اپنے زوال پر سلام

مجلسِ مشاورت:

مجلّہ	----------	تخلیقی ادب (ISSN # 1814-9030)
اشاعت	----------	سالانہ
شمارہ	----------	چار - جنوری دو ہزار سات
سرورق	----------	عابد سیال
ناشر	----------	نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، ایچ نائن، اسلام آباد۔
پریس	----------	نمل پرنٹنگ پریس، اسلام آباد۔
ای میل شعبہ اردو	----------	numl_urdu@yahoo.com

نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد

(ISSN # 1814-9030)
تخلیقی ادب
یونیورسٹی آف ماڈرن لینگوئجز
اسلام آباد